مقالات

مقتضیاتِ ایمان

(۵)

از جناب مولانا سید صبغۃ اللہ صاحب بختیاری

۴۔ ایمان بالکتاب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے نہ صرف انبیاء و رسل کو بھیجا بلکہ ان پر اپنی کتابیں بھی اتاریں، جو حکومت الٰہیہ کا آئین و دستور، اور ہدایت نامہ ہیں۔ دراصل یہی وہ چیز ہے جس کو پہنچانے، پڑھکر سنانے، کھول کھول کر سمجھانے، اور جس کے منشا کے مطابق زندگی کا پورا نظام عملاً قائم کرکے دکھا دینے کے لیے نبی کی بعثت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کی تشکیل اور انسان کی تمام مادی و روحانی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اصول و قواعد اور کلیات و احکام کے ایسے مجموعے دیے ہیں جو فطرت کے عین مطابق اخلاق و روحانیت، فکر و نظر، تہذیب و تمدن، معاشرت و معیشت، سیاست اور نظم ملکی، غرض انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر گوشے کو درست کرتے ہیں۔ ان ناموں کا ہر لفظ و معنی خالص و بے آمیز وحیٔ الٰہی ہوتا ہے۔ کتاب کے اندر رسول کی اپنی فہم و فراست، فکر و نظر اور قصد و ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ کتاب ایک امانت خداوندی ہوتی ہے جو اس کے بندوں تک بے کم و کاست، بلا کسی ادنیٰ سے ادنیٰ تغیر و تبدل کے پوری حفاظت اور ذمہ داری کے ساتھ پہنچا دی جاتی ہے۔ پھر اس کو لانے والے رسول کی شخصیت اپنی سیرت و کردار میں اس کتاب کے مقصد و مدعا کا مجسم نمونہ ہوتی ہے اور رسول اس کو انسانوں میں اپنی دعوت و تبلیغ سے اور عملی جد و جہد سے حکمت کے ساتھ بتدریج جاری و نافذ کرتا ہے۔

ان کتابوں کے نازل کرنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انسان کے افکار، اخلاق اور اعمال کے لیے ایک معیار مقرر کر دیا جائے جس کے مطابق پوری انسانی زندگی اپنے تمام پہلوؤں سمیت

ڈھل جائے۔ ہر وہ معیار توڑ دیا جائے جو اس کے خلاف ہو۔ ہر وہ قانون زندگی مٹا دیا جائے جو اس کی ضد ہو۔ مخلوق صرف اپنے خالق کے فرمان کی مطیع ہو۔ اور تابع فرمان افراد کی ترکیب سے ایک ایسی مسلم سوسائٹی وجود میں آئے جس کے افکار و اعمال اور رجحانات و میلانات کا پورا دار و مدار، خدا پرستانہ نظریہ پر ہو نہ کہ باغیانہ خود مختاری پر۔ جس کے عمل کی بنیاد ایک مستقل قانون اخلاق پر ہو نہ کہ تجربہ و مصلحت کی زی ابن الوقتی پر کہ پتے کی طرح جدھر جدھر ہوائیں اسے اڑائیں وہ اڑتی پھرے۔

قرآن عزیز نے اُن تمام الٰہی کتابوں اور آسمانی صحیفوں کو ماننے کی تلقین کی ہے جو تمام رسولوں پر اللہ تعالیٰ نے اتاری ہیں خواہ وہ کسی زمانے، کسی قوم اور کسی زبان میں آئی ہوں۔ بعض کا ذکر صراحت کے ساتھ کیا گیا ہے اور بعض کا ذکر مجمل ہے۔ توریت، انجیل، زبور اور صحف ابراہیم کا صاف صاف تذکرہ موجود ہے اس لیے ان پر ان تمام کیفیتوں اور خصوصیتوں کے ساتھ ایمان لانا ہوگا جو قرآن عزیز میں بیان کی گئی ہیں۔ جہاں اجمال ہے وہاں ایمان بھی مجمل رہے گا اور جہاں تفصیل ہے وہاں ایمان میں اتنی ہی تفصیل ہوگی جتنی قرآن میں پائی جاتی ہے۔ تاریخی استناد یا دوسرے ذرائع سے اس میں زیادتی اور اضافہ کر کے خواہ مخواہ کی بحثوں کا دروازہ نہ کھولنا چاہیے جیسا کہ عام اہل مناظرہ کا شیوہ ہے۔

جتنی کتابیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے انبیاء پر آئی ہیں ان سب کا منبع اور ماخذ ایک ہی ہے۔ سب میں ایک ہی نور حقیقت کی روشنی جلوہ افگن ہے۔ اس لیے کسی ایک کو جھٹلانا اور کسی ایک کو مان لینا جائز نہیں ہو سکتا۔ مانیں تو سب کو مانیں اور انکار کر دیں تو سب کا انکار ہو۔ لیکن اس ماننے کے معنی صرف یہ ہیں کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا تھا وہ برحق تھا، نہ یہ کہ جو کچھ اب ان کتابوں میں اہل کتاب کی تحریفات کے بعد پایا جاتا ہے وہ سب بھی برحق ہے۔ دنیا میں آج تحریف سے محفوظ صرف ایک کتاب پائی جاتی ہے اور وہ قرآن ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ قرآن مجید کی روشنی میں تمام کتب سابقہ پر تنقید کی جائے اور ان کا صرف اتنا حصہ صحیح و سالم مانا جائے جو قرآنی تعلیمات کے مخالف نہ ہو۔ قرآن حکیم تمام الٰہی کتابوں کا محض مصدق (تصدیق کرنے والا) ہی نہیں ہے بلکہ ان پر "مہیمن" بھی ہے۔ یعنی محافظ و نگراں۔ پس جو تحریفات اہل کتاب نے کلام الٰہی میں کی ہیں وہ قرآن کے معیار پر جانچ کر چھانٹ دی جا سکتی

ہیں اور ہر کتاب میں سے وہ حصے الگ نکال لیے جا سکتے ہیں جو کلام الٰہی میں سے اب تک ان کے اندر باقی ہیں۔

قرآن کے ہوتے ہوئے تمام پچھلی آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ انسان کو اس حقیقت کا پورا ادراک ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی دور ایسا نہیں چھوڑا ہے جس میں اس نے اپنے فضل و کرم سے نوع انسانی کے لیے تذکیر و یاد دہانی، موعظت و اعتبار، اور اصلاح کا سامان نہ اتارا ہو اور انسانی زندگی کے لیے مفصل قوانین نہ دیے ہوں۔ اُس کی طرف سے ہر زمانہ میں تشریعی رہنمائی کا اُسی طرح بندوبست اور کامل و مکمل انتظام فرمایا گیا ہے جس طرح تکوینی اسباب کے تحت طبعی ساز و سامان حیات کی فراہمی کا انتظام کیا گیا ہے۔ اب اگر اس میں تحریف ہوئی تو اسی طرح ہوئی جس طرح انسان اپنی خواہشات نفس کے اتباع میں خدا کے پیدا کئے ہوئے پاک رزق کے اندر تحریف کرتا رہا ہے۔ جس طرح انسان نے غلے اور پھل جیسے عمدہ سامان غذا کو سڑا کر شراب جیسی عقل کو خراب کرنے والی چیز بنائی اور جس طرح انسان نے ہوا جیسی صاف چیز کو تمباکو کے دھوئیں سے آلودہ کر کے اپنے پھیپھڑوں میں پہنچانا پسند کرتا ہے، اسی طرح انسان خدا کی بھیجی ہوئی صاف ستھری ہدایت میں بھی اپنی خواہشات نفس کی، اپنے تعصبات کی، اور اپنے تخیلات کی آمیزش بھی کرتا رہا ہے۔ پھر جس طرح ایک صحیح الدماغ اور سلیم الفطرت آدمی کا کام یہ ہے کہ جب خالص غذا مل رہی ہو تو آمیزش کی ہوئی غذا نہ کھائے اور جب صاف ہوا مل رہی ہو تو دھوئیں کی ماری ہوئی ہوا میں سانس نہ لے، اسی طرح اس کا کام یہ بھی ہے کہ جب قرآن کی صورت میں اسے خدا کی خالص ہدایت مل رہی ہو تو خواہ مخواہ اپنے آبائی تعصبات کی بنا پر ان کتابوں کے ساتھ نہ چمٹا رہے جن میں ہدایت الٰہی انسانی آمیزشوں کے ساتھ خلط ملط ہو گئی ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ قرآن سے پہلے آئی ہوئی کتابوں میں ان کے ماننے والوں نے اپنی طرف سے بہت سی چیزیں ملا کر اللہ کے کلام کو اس قدر بدل دیا ہے کہ آج ان میں سے کوئی کتاب بھی اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہیں رہ سکی ہے۔ انھوں نے الفاظ میں بھی آمیزش کی ہے اور معنوں کو بھی بدلا اور بگاڑا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ترجمہ در ترجمہ سے یہ کتابیں اور زیادہ مسخ ہو گئی ہیں اور

اب ان میں خدا کی خالص ہدایت کا پا لینا ممکن نہیں رہا ہے۔ پھر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب قرآن کی تصدیق کردہ کتب سماوی میں تغیر و تبدل اور تحریفات کا یہ حال ہے تو ان کتابوں کا حال کیا ہوگا جو محض ان کے ماننے والوں کی مزعومہ عقیدت مندی کے باعث "کتب الٰہی" کہلاتی ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ ان میں سے بعض میں الٰہی روشنی کے کچھ آثار ضرور محسوس ہوتے ہیں، مگر ان کے ساتھ ہی ساتھ خرافات و اوہام، غیر عقلی و غیر فطری امور، اخلاق سے گری ہوئی باتیں، اور نسلی و قومی اور طبقاتی تعصبات بھی ان کے اندر موجود ہیں اور ایک معقول آدمی کے لیے یہ سخت مشکل ہے کہ ان کو خدا کی کتابیں بھی مانے اور ان کی لغویات کا انکار بھی کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتابیں انسانی زندگی کے لیے کوئی صالح نظام تمدن تو کیا سرے سے موجودہ زمانے کی متمدن زندگی کے لیے کوئی بنیاد بھی فراہم نہیں کرتیں اور یہی باعث ہے کہ آج ان کے پیروؤں کی حالت زار یہ ہے کہ وہ اپنی "مذہبی کتابوں" کو مانتے ہوئے اور اپنے مذہبی پوجا پاٹ کے مراسم کی پابندی کرتے ہوئے بھی ہر مادی فلسفے اور ہر غیر مذہبی و غیر روحانی نظام زندگی کی تحریکات کا ساتھ دیے چلے جاتے ہیں۔ موجودہ دور کے انسانی مسائل کا کوئی حل ان کو اپنی اُن کتابوں میں نہیں ملتا جن کے متعلق وہ یقین رکھتے ہیں کہ خدا کی کتابیں ہیں۔

پس قرآن جب پچھلی کتابوں پر ایمان لانے کے لیے کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ان کتابوں کو جیسی کہ وہ اب پائی جاتی ہیں جوں کا توں مان لیا جائے۔ درحقیقت اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان قرآن پر ایمان لاتے وقت اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے کہ وہ اُس ہدایت کو مان رہا ہے جو پہلی مرتبہ ساتویں صدی عیسوی میں آئی ہے، بلکہ یہ سمجھتے ہوئے مانے کہ یہ وہی ازلی و ابدی ہدایت ہے جو ہر زمانے میں خدا نے انسانوں کو دی ہے۔ یہی معنی ہیں اس ارشاد کے کہ:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (بقرہ)

اور (قرآن سے ہدایت پانیوالے متقی وہ ہیں) جو ایمان لاتے ہیں اُس پر جو تمھاری طرف (اے محمد) اتارا گیا ہے اور اس پر بھی جو تم سے پہلے (پیغمبروں پر) اتارا گیا تھا۔

یعنی ایمان کے لوازم میں سے یہ ہے کہ صداقت کو مانے خواہ دنیا میں جس نے بھی پیش کی ہو، اور یہ

نہ کہے کہ میں صرف اپنے گھر کی صداقت کو مانوں گا اور ہر اس چیز سے انکار کر دوں گا جو میرے گھر کی نہ ہو خواہ وہ بھی صداقت ہی ہو، جیسا کہ یہودیوں کا حال تھا کہ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَاءَهٗ (بقرہ) ایک صداقت پسند آدمی تو ہر اس سچائی کو مانے گا جو فی الواقع اللہ کی جانب سے آئی ہوئی ہو۔ سچائی کو ماننے میں کوئی نسلی غرور، کوئی قومی تکبر اور کوئی رنگ و وطن سدِ راہ نہ ہونا چاہیے۔ یہ اعلیٰ درجہ کی بلند خیالی اور اولوالعزمی ہے کہ ایک مسلم حق کو بحیثیت حق کے مان لیتا ہے خواہ وہ دنیا میں کہیں پایا جائے اور باطل سے منہ موڑ لیتا ہے خواہ وہ اس کے اپنے گھر میں ہو۔

پھر قرآن جو کچھ خود اپنے متعلق کہتا ہے وہ یہ ہے کہ میں خدا کی خالص اور بے میل ہدایت ہوں جس میں دوسری کتب آسمانی کی طرح کوئی تحریف اور آمیزش نہ ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ لہٰذا ایمان بالکتاب کا تقاضا کہ کتب آسمانی کی پیروی کی جائے صرف اسی طرح پورا ہو سکتا ہے کہ قرآن کی پیروی کی جائے۔ دوسری کتابوں پر ایمان اجمالی تصدیق کی حد تک ہے، اور قرآن پر ایمان کا حق تصدیق، کامل اتباع اور قطعی اطاعت کے لیے ہے۔ قرآن پر ایمان لانے کے معنی دراصل یہ ماننا ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے وہ سراسر حق اور عین علم ہے۔ اس کے عقائد اور تصورات، اس کے اصول اور کلیات، اس کی اخلاقی ہدایات، اس کے اوامر و نواہی، اس کے قوانین اور ضوابط سب کو چوں کاتوں اور بے چون و چرا مان لیا جائے اور ان کے متعلق یہ اذعان و ایقان ہو جائے کہ ہماری زندگی کے لیے صحیح راستہ صرف وہ ہے جو اس کتاب میں بتایا گیا ہے، اور ہر وہ چیز غلط ہے جو اس کے خلاف ہے۔ جب تک یہ ذہنی مرحلہ پورا نہ ہو جائے کوئی خارجی مرحلہ آ ہی نہیں سکتا اور نہ عملی زندگی کے مطالبات ہی سامنے لائے جا سکتے ہیں۔ ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان مطلوب کی تعبیر اس طرح فرمائی ہے کہ یہ ایمان "ما جئت بہ" پر ہونا چاہیے، یعنی میں جو نظام زندگی اللہ کی طرف سے انسانی دنیا کے لیے لایا ہوں، جب تک کوئی اس کل کے کل کو نہ مانے اور بحیثیت مجموعی اس پر ایمان نہ لائے وہ مومن ہی نہیں ہو سکتا۔

اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ اگر کچھ لوگ ایسے ہوں جو قرآنی نظام زندگی کے کسی حصے کو تو قابل

عمل قرار دیں اور کسی حصہ کے متعلق یہ خیال کریں کہ وہ اس دور میں قابلِ عمل نہیں ہے، یا یہ نظریہ رکھیں کہ اس دوسرے حصہ کو محض برحق مان لینا کافی ہے اور برحق مان لینے کے بعد یہ بالکل حق ہے کہ ہم دنیا کے جس چلتے ہوئے نظام کی چاہیں پیروی کریں، یا یہ سمجھیں کہ چوری پر ہاتھ کاٹ ڈالنا، زنا پر کوڑے لگانا یا سنگسار کر دینا، سود کا حرام ہونا اور اسی قسم کے دوسرے قوانین اس "روشن زمانے" کے لیے موزون و مناسب ہی نہیں ہیں بلکہ یہ تو عرب کے ماحول کی وحشت کے لیے مناسب تھے، تو ایسے لوگوں کے "ایمان" کا کیا اعتبار ہوگا۔ پھر اُن قومی تحریکوں، اداروں اور انجمنوں کا کیا حکم ہوگا جو اسی قسم کے افکار و خیالات رکھنے والے لوگوں کی فکری و عملی رہنمائی میں چل رہی ہوں اور جن میں شامل ہونے کے لیے سرے سے ایمان کی ضرورت ہی نہ ہو بلکہ "قومی فوج" میں بھرتی ہونے کے لیے محض ایک فارم کی خانہ پری کافی ہو۔ اُس گروہ پر تو چنداں تعجب نہیں ہے جس نے مغربی طرز کی تعلیم و تربیت پائی ہے اور جو محض قوم پرستانہ جوش و خروش میں اتنا ہی سوچ سکتا اور کر سکتا ہو جتنا کر رہا ہے، لیکن حیرت ہے اُن مقدس اور مزکی ہستیوں پر جو "ایمانیات" اور اس کے تمام اساسی معتقدات کو خوب اچھی طرح جاننے کے باوجود اُن امور میں وقت، قوت اور اپنی نیک سیرت کو ضائع کر رہے ہیں جو "ایمان بالقرآن" کے بالکل منافی اور ضد ہیں۔

ہمارے نزدیک قرآن پر ایمان لانے کا حقیقی مقتضٰی یہ ہے کہ ہم اس نظامِ زندگی کو عملاً قائم کرنے کی جد و جہد کریں جو قرآن پیش کر رہا ہے اور اپنی زندگی پر سے نیز اپنے گرد و پیش کی زندگی پر سے ان نظاموں کے تسلط کو مٹانے کی سعی کریں جن کو قرآن باطل کہتا ہے۔ اس سعی و جہد سے اس لیے منہ موڑنا کہ اس میں دنیوی نقطۂ نظر سے کامیابی کی امید نہیں ہے، فی الواقع ایک غیر ایمانی حرکت ہے، اور اس سے بڑھ کر غیر ایمانی حرکت یہ ہے کہ قرآن کے منشا کے خلاف جو نظام ہیں انھیں قائم کرنے کے لیے تگ و دو کی جائے محض اس لیے کہ ان میں کامیابی کی توقع ہے۔ کیا ہم قرآن پر ایمان دنیوی کامیابی کی شرط کے ساتھ لائے ہیں؟ ہم کو حق پر ایمان لانے کے لیے کہا گیا تھا یا اُس چیز پر جو دنیا میں کامیاب ہو سکتی ہو خواہ حق ہو یا باطل؟ پھر آخر یہ کیا جاہلیت کا تصور ہے کہ قرآنی نظام قائم کرنے کی جد و جہد کبھی ناکام بھی

ہو سکتی ہے؟ اس میں تو کامیابی یقینی ہے بشرطیکہ کامیابی کا وہ تصور مراد لیا جائے جو قرآن نے پیش کیا ہے نہ کہ وہ پرستانہ تصور۔ قرآن جسے فوز و فلاح کہتا ہے اس سے تو یہ جد و جہد کبھی محروم ہی نہیں رہ سکتی۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ قرآن جس چیز کی دعوت دیتا ہے اس کے قیام کی سعی کرنا ایک سخت مشکل کام ہے، زبردست قربانی کا طالب ہے اور جب تک اس راہ میں سر دھڑ کی بازی نہ لگا دی جائے اس کے بالفعل قائم ہونے کا امکان نہیں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا کا اور کون سا وہ نظام ہے جو قربانی، جانفشانی اور سخت کوشی کے بغیر قائم ہو جاتا ہو؟ یہ دنیا تو عالم اسباب ہے۔ یہاں فطرت کے قانون کی کارفرمائی ہے۔ جب تک اسباب کار مہیا نہ کیے جائیں اور کام میں پوری طرح انہماک نہ ہو اس وقت تک کوئی کام بھی یہاں بن نہیں آ سکتا غیر قرآنی مقاصد کے لیے بھی آخر آپ سب کچھ کرتے ہی ہیں۔ جان، مال، وقت اور محنت سب کچھ کھپاتے ہیں۔ فائدے بھی قربان کرتے ہیں اور تکلیفیں اور نقصان بھی اٹھاتے ہیں۔ اب یہ ایمان کا نقص نہیں تو اور کیا ہے کہ جو آپ قرآن کے مخالف نظاموں کے لیے کر سکتے وہ قرآنی نظام کے لیے نہیں کر سکتے۔

بہرحال اس دور میں ایسی ایک اسلامی تحریک کی ضرورت ہے جو عین "مقتضیات ایمان" پر مبنی ہو اور تمام باطل تحریکات کے علی الرغم انسانیت کے سارے مسائل کو ان اصولوں کے مطابق حل کرنے کی کوشش کرے جو قرآن نے پیش کیے ہیں۔ یہ نہ صرف ایمان بالقرآن کا تقاضا ہے بلکہ فی الواقع آج دنیا کو ایسی ایک تحریک کی ضرورت بھی ہے۔ اگر ایسا کیا جائے تو خوش قسمتی سے اس وقت دنیا کے بین الاقوامی حالات ایسے ہیں کہ اس کا کامیاب ہونا اور آگ کی طرح پھیل جانا عین ممکن ہے بلکہ شاید ایسا نہ ہونا غیر ممکن ہے۔ البتہ اس کے لیے ایک مضبوط، منظم، صادق القول، صالح جماعت کی ضرورت ہے جس کے ہر فرد کی سیرت اسی مقصد میں ڈھلی ہوئی اور اسی کے لیے جینے اور مرنے والی ہو۔

رسائل و مسائل

"حکومت الٰہیہ" اور "پاپائیت" کا اصولی فرق

سوال: کچھ عرصہ ہوا کہ رسالہ پیغام حق لاہور میں جناب ابو سعید بزمی صاحب کا مضمون "حکومت کا اسلامی تصور" نظر سے گذرا۔ اس مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

"اسلامی سیاست کا ایک تصور وہ بھی ہے جسے حال ہی میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے بڑے زور شور کے ساتھ پیش کیا ہے اور جس کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ حکومت عوام کے سامنے جوابدہ نہ ہو۔ تاریخی حیثیت سے یہ اصول نیا نہیں۔ یورپ میں ایک عرصہ تک تھیا کریسی (Theocracy) کے نام سے اس کا چرچا رہا اور روم کے پاپائے اعظم کا اقتدار اسی تصور کا نتیجہ تھا۔ لیکن لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ چونکہ خدا کوئی ناطق ادارہ نہیں اس لیے جس شخص کو خدا کے نام پر اختیار و اقتدار مل جائے وہ بڑی آسانی سے اس کا غلط استعمال کر سکتا ہے۔ مولانا مودودی کے حلقۂ خیال کے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا تصور سیاست پاپائے اعظم کے تصور سے مختلف ہے، لیکن چونکہ وہ عوام کو جوابدہ قرار نہیں دیتے اور اسی بنیاد پر جمہوریت کو غلط سمجھتے ہیں اس لیے نتیجۃً ان کا تصور پاپائے اعظم ہی کا تصور ہو کر رہ جاتا ہے۔"

پھر بزمی صاحب اپنی طرف سے ایک حل پیش کرتے ہیں لیکن وہ بھی وجہ تسلی نہیں ہوتا۔ آپ براہ کرم ترجمان القرآن کے ذریعے اس غلط فہمی کا ازالہ فرما دیں اور صحیح نظریہ کی توضیح کر دیں۔

جواب: بزمی صاحب نے غالباً میرا مضمون "اسلام کا نظریہ سیاسی" ملاحظہ نہیں فرمایا ہے ورنہ وہ دیکھتے کہ جو اعتراضات انھوں نے میرے مسلک پر کیے ہیں ان کا پورا جواب اس مضمون میں موجود ہے لیکن اگر انھوں نے اس مضمون کو پڑھا ہے اور پھر یہ اعتراضات کیے ہیں تو میں سوائے اس کے کہ